"جی بہت اچھی لڑکی ہے وہ نیک سادہ مزاج . . ."

"باپ کیا کرتا ہے لڑکی کا"

باپ؟ . . . کونسا باپ؟ . . . آج تک غازی نے سوچا تک نہ تھا کہ گلنار کا باپ کیا کرتا ہے؟ ہاں گلنار کی بی بی جی پرانی نائیکہ تھیں۔ سر پر سفید دوپٹہ لے کر کانوں کے دونوں طرف اڑسا رکھتی تھی۔ گلنار سے پیشہ کرواتی تھیں۔ پانچ وقتہ نمازی تھیں۔ اور بلا کا اچھا کھانا پکاتی تھیں۔ ان کے پکتے ہوتے شلغم گوشت، کرم کا ساگ اور مچھلی تو بس ایسی تھی کہ منہ سے لیکر معدے تک ہر جگہ سے لپیٹ آنے لگتی۔

"وہ جی باپ تو اس کا . . ."

"سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں" اباجی کی زبان میں لکنت آگئی۔

تھر تھر کانپتے ہوئے غازی بولا۔

"جی . . . اس کا باپ نہیں ہے"

"اچھا، بیوہ کی اولاد ہے"

وہ تن سنگھ شرپا کی طرح ماونٹ ایورسٹ سر کرنے کے درپے تھا۔

"جی نہیں بیوہ نہیں ہے اس کی ماں . . ."

اباجی نیاز محمد سونٹے کی طرح سیدھا ہو گیا

"طلاق ہے کیا؟ . . ."

اب غازی کو محسوس ہوا کہ جس قدر وہ اس معاملے کو سہل سمجھتا تھا اتنا یہ مسئلہ

سیدھا نہیں ہے۔

"نہیں جی . . . طلاق تو نہیں ملا ہُوا نہیں . . ."

"تو کیا حرام کی اولاد ہے کسی کی . . . بول"

"جی وہ . . . وہ بہت نیک ہے۔ معاشرے نے انہیں اس دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ وہ فرشتوں کی طرح نیک ہے . . . لیکن حالات اسے . . ."

"پیشہ کروانے پر مجبور ہیں" آباجی فقرہ مکمل کرتے ہوتے بولے۔

"جی . . ."

"کیا کہا . . ."

"جی . . ."

"نکل جاؤ اسی وقت یہاں سے۔ الّو کے پٹھے، حرامزادے۔ کسی گشتی کی اولاد نکل جاؤ . . . ابھی اسی وقت"

"اچھا جی . . ."

"میرا منہ کھڑے کیا تک رہے ہو؟ پہلے سردار اس گھر سے نکلا۔ پھر اکبر کو نکلنا پڑا میری ساری امید تم سے وابستہ تھی۔ تم بھی نکل جاؤ"

"اس وقت کہاں جاؤں آباجی . . . صبح لاہور چلا جاؤں گا"

"اسی وقت۔ اسی لمحے . . . اسی گھڑی نکل جاؤ۔ الّو کے پٹھے، گشتی کی اولاد، حرامزادے . . ."

غازی اپنا سامنہ لیکر باہر کی طرف چلنے لگا، اصطبل کے قریب اسے ساجھا مل گیا۔ وہ تالڑاں سے آئی ہوئی گھوڑی کو جسے وہ پری کہتا تھا۔ دانہ ڈال کر آ رہا تھا۔

"کدھر بھاجی؟ . . . . اس وقت؟"

"بس کہیں نہیں . . . ."

"صغراں کی تو شادی ہو گئی پچھلی جمعرات . . ." ساجھا گڑے مردے اکھیڑنے لگا۔

"میں صغراں سے ملنے نہیں جا رہا . . . ."

"سید جے کمہار کی بیوہ تو آج کل گدڑو شاہ کے چیلے کی چیلی بنی ہوئی ہے۔"

"بکو مت۔"

"پتہ نہیں اس گاؤں کی لڑکیوں کو کیا مار ہے ہنس ہنس کر ساجھے سے باتیں کرتی ہیں۔ اور بار بار نے کہیں اور لگاتی ہیں۔ کڑ کڑ کہیں اور انڈے کہیں . . ."

"ایک چارپائی ہو تو دے دو ورنہ چپ رہو۔"

"ایک چارپائی، بادشاہو۔ لکھ چارپائیاں لگا۔ ہمارے تو گھوڑے بھی چاہیں تو رنگیلے پلنگوں پر سو سکتے ہیں۔"

جب ساجھا غازی کے لئے چارپائی لے آیا تو وہ چند منٹوں میں کھری چارپائی پر لیٹ کر جوانی کی نیند سو گیا۔ اس کے سر سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا تھا۔

لیکن جیسے یہ سارا بوجھ اتر کر ملک نیاز محمد صاحب کے کندھوں پر جا پڑا . . زخم خوردہ تو پہلے ہی تھا۔ تیسرے بیٹے کو گھر سے نکال کر یک دم زندگی خالی ہو گئی

بڑی حویلی میں غازی کو آوازیں دیں۔ نذیراں، بگا، اور جبروت دبے دبے ادھر ادھر غازی کو ڈھونڈنے لگے۔

ملک صاحب چیخ چیخ کر للکار رہے تھے۔

"کہاں گیا ہے وہ الو کا پٹھا . . . گشتی کی اولاد . . . اس وقت کہاں گیا ہے بدبخت سور، . . . رات کے وقت کہاں منہ کالا کرتا پھرتا ہے؟ . . . زندگی حرام کر دی ہے ان لوگوں نے، دیکھو ناں نہ کسی سے پوچھا نہ سنا گھر سے چلا گیا اٹھ کر . . . ہم شرم کے مارے نہ کسی سے پوچھ سکتے ہیں نہ کسی کو بتا سکتے ہیں . . حرامزادہ، گشتی کی اولاد . . ؟

بکتے جھکتے صبح کے قریب جب چودھری نیاز محمد کی آنکھ لگ گئی تو اس وقت انہیں جاگ آئی جب غازی اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ غازی سوٹ کیس کو چابی گھما کر مقفل کرنے ہی والا تھا کہ اباجی آن وارد ہوئے۔

"میں نے رات کو تجھے کہہ نہیں دیا تھا سور زادے کہ اس گھر میں تیرے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ یہاں تو کیا لینے آیا ہے؟ طوائف کے عاشق؟"

"میں جی اپنا سامان لینے آیا ہوں . . ."

"سامان؟ یہ تیرا سامان ہے کہ میری دولت، کسی نواب کی اولاد۔ پڑھائی کرنے گیا تھا لاہور کہ طوائفوں کی جلیبیں بھرنے۔ بول . . بول . . بول . . ."

یکبارگی غصے کے مارے اباجی کا منہ کھلنے بند ہونے لگا، لیکن آواز بند ہو گئی۔

بالکل خاموش فلموں کی طرح۔

مگر تھوڑی دیر یہ کیفیت رہی۔ غازی سر جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا۔ لیکن پھر جب اس نے جبروت کو تانگا جوتنے کے لئے کہا تو یکدم اباجی کے گلے میں لاؤڈ سپیکر لگ گیا۔

"جوتا مار کر چلے جاؤ ۔ ۔ ۔ بڈھے باپ کے منہ پر۔ تم کو تو یاد بھی نہیں کہ میں نے کس مصیبت سے تم کو پالا ہے۔ دوسری بیوی نہیں کی کہ یہ شہدے کس طرح پلیں گے؟ جا جا ۔ ۔ ۔ جاتا کیوں نہیں؟ کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔ نکل جا۔ میری نظروں سے دور ہو ۔ ۔ ۔ گشتی کی اولاد ۔ ۔ ۔ الو کا پٹھا ۔ ۔ ۔ طوائف کا حمایتی! ۔ ۔ ۔"

جب لاہور واپس پہنچ کر یہ سارا واقعہ اس نے من وعن ظفر کو سنایا تو اسے پورا یقین تھا کہ اب اسے گاؤں سے کوئی منی آرڈر نہیں آئے گا اور اسے پڑھائی کا سلسلہ منقطع کرنا پڑے گا۔ لیکن جب اسی مہینے پانچسو روپے کا منی آرڈر آ گیا تو غازی اور ظفر نے سرد جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ چھوڑ دیا۔ اور اباجی سے باقاعدہ معافی مانگ لی۔

ظفر کو وہ دن بری طرح یاد آ رہے تھے، جب گلنار سے شادی کرنے کا بھوت پہلے پہل غازی پر چڑھا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو تم؟ ۔ ۔ ۔" غازی نے سوال کیا

"میرا خیال ہے، اب تم گلنار سے شادی کرنا نہیں چاہتے۔"

"کون میں؟ . . . کس کی بات کر رہے ہو؟"

"تمہاری اور کس کی۔"

"میں تو آج بھی گلنار سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور زندگی کے آخری سانس تک اگلی زندگی کے آخری سانس تک اور قیامت کے روز جب حضرت اسرافیل صور پھونکیں گے تب بھی میں اس سے شادی کرنا چاہوں گا۔"

ظفر کی نظروں میں رشیدہ کا چہرہ گھومنے لگا۔

"پھر کرتے کیوں نہیں۔"

"اب وہ نہیں مانتی . . ."

"وہ نہیں مانتی؟ . . . کیا مطلب؟" ظفر نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

"وہ کہتی ہے دو سال پہلے میں تیار تھی۔ لیکن تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب مجھے اپنے پیشے سے پیار ہو گیا ہے تو تم چاہتے ہو میں اسے چھوڑ دوں اور ہاتھ کٹوا کر بیٹھ جاؤں . . ."

"پیشے سے پیار ہو گیا ہے . . . لیکن وہ تو تمہاری محبت کا دم بھرتی تھی۔"

"یہی تو مشکل ہے۔ محبت تو وہ مجھ سے ہی کرتی ہے۔ لیکن . . . لیکن پتہ نہیں کب میں نے اس کی انا کو مجروح کر دیا ہے۔ اُسے یقین نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ مجھے کہتی ہے مجھ پر ترس نہ کھاؤ۔ میرے لئے یہی زندگی بہتر ہے۔ میں گھریلو عورت نہیں بن سکتی۔ مجھ میں وہ [illegible] نہیں رہ سکا۔ جس سے چھوٹے گھر میں

اجالا ہو سکتا تھا۔ میں اب فانوس کی روشنی ہوں، بڑی سڑک پر کوکا کولا کا سائن بورڈ ہو
مجھے آسائش سے محبت ہو گئی ہے . . . . میں اسے لاکھ یقین دلاتا ہوں بہتیرا سمجھا
ہوں۔ لیکن وہ نہیں مانتی . . . . نہیں مانتی گدھی کہیں کی۔"

"شادی کے متعلق امتحانوں کے بعد سوچنا۔ فی الحال ایم اے کی طرف توجہ دو۔ گلنار
کہیں بھاگی نہیں جاتی۔"

"مجھے یوں لگتا ہے وہ مجھے چڑانے کی خاطر کسی سے کسی دن شادی کرے گی۔"

"نہیں کرتی نہیں کرتی، بابا . . . خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا؟"

"بالکل . . ."

"عجیب سی ڈھارس بندھ گئی ہے تمہاری بات سے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ تمہا
پاس انگلش پر نوٹس ہیں پروفیسر حیدر کے؟"

"ہاں۔"

"ذرا مجھے دے سکو گے دو چار دن کے لئے، میں نے پچھلے دنوں ایک نوٹ بھی
لیا۔"

غازی، کو ظفر نے اپنے نوٹس پکڑا دیئے تو وہ خاموشی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

ظفر کو وہ رات یاد آگئی جب وہ اسی طرح بڑی آہستگی سے غازی کے ساتھ گل
کے کوٹھے پر گیا تھا۔ گلنار گا بجا کر ابھی اوپر آئی تھی۔ وہ دونوں اوپر پہنچے تو سب سے پ

اس کی نظر بی بی جی پر پڑی۔ وہ تخت پوش پر بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ سلام پھیر کر انہوں نے بڑے تپاک سے کہا۔

"آؤ بیٹا غازی آؤ آؤ! رک کیوں گئے، آجاؤ۔۔۔"

غازی بی بی جی کے پاس تخت پوش پر بیٹھ گیا۔

"اتنے دن کہاں رہے؟"

"امتحان تھا جی، بی اے کا۔۔۔ بس اسی کی تیاری میں لگا رہا۔"

"اچھا اللہ پاس کرے، بڑا افسر کرے، نصیبوں میں بھلے دن لکھے ہوں۔ ملک کی قسمت تجھ سے کھلے۔ غریبوں کو تجھ سے فیض حاصل ہو۔۔۔ یہ کون ہے؟"

"یہ ہے جی میرا دوست ظفر۔"

"اچھا اچھا، سلامت رہے خوش رہے۔"

"ابھی نیچے سے آئی ہے نازی۔۔۔ نازی!۔۔۔ بیٹی نازی، غازی آیا ہے۔۔۔ نازی غازی، غازی نازی۔۔۔ کیا پیارے نام ہیں۔۔۔ غازی آیا ہے اے۔۔۔" بی بی جی نے گلنار کو آواز دی جسے وہ پیار سے نازی بلاتی تھیں۔

گلنار غسل خانے میں تھی اور پانی کے چھپاکوں کی آواز آرہی تھی۔

"جمعرات کو بھی نہیں آئے تم اس دفعہ۔ مجھے تو فکر سا ہو گیا۔ جی میں آئی کہ ہوسٹل جاکر دیکھوں، پھر میں نے سوچا خواہ مخواہ۔۔۔ کہیں تمہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔"

"وہ جی میں نے بتایا ناں آپ کو امتحان ہو رہے تھے۔۔۔"

ایک بار پھر بی بی جی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر پھیر کر دعائیں دینے لگیں۔۔

"جمعرات کو تو نازی نہ کسی مجرے پر جاتی ہے نہ گانے کی محفل گھر پہ لگاتی ہے۔ تو گنڈے کی قبر پر خود جا کر چراغی چڑھاتی ہے۔ اس بار بسم اللہ کے بیٹے کے ختنے تھے جمعرات کو ہی میں نے لاکھ لاکھ کہا چل گلنار۔ ان کے گھر بھاری بارہ پگڑیوں کی مٹھائی بنتی ہے۔ چل ذرا گھڑی دو گھڑی ہنس بول آئیں۔ کہنے لگی نہ بی بی جی۔۔۔ جمعرات کو ملک غازی آتے ہیں ہمیشہ۔۔ پیروں فقیروں کا دن ہے۔ میں کسی طوائف کے گھر نہ جاؤں گی۔ میں نے ہنس کر پوچھ لیا اور تو کیا ہے بیٹی؟ بس جی اتنا روئی اتنا روئی کہ آنکھیں سوج گئیں، نزلہ ہو گیا۔ اس بات کا ذکر نہ کرنا اس سے، ناراض ہو جائے گی مجھ سے۔۔ ۔ آ جا نازی۔۔ ۔ توبہ کتنے گھنٹوں میں منہ دھوتی ہے تو۔ دیکھ تو غازی صاحب کب سے آئے بیٹھے ہیں۔"

گلنار سفید رنگ کی بے جان سی لڑکی تھی جسے بات بات پر پلکیں جھپکانے اور لب کاٹنے کی عادت تھی۔ ماتھا مردوں کی طرح اونچا کھلا اور کرنے وار تھا۔ بات کو عموماً درمیان میں ہی چھوڑ دیتی، کسی کی بات سنتی تو دائیں بائیں یوں دیکھنے لگتی جیسے خوفزدہ ہو۔ ڈھنگ سے میک اپ کرنے کا طریقہ ابھی اس نے شاید اس لیے نہ سیکھا تھا کہ اس کی سفید چمڑی ابھی جلوہ آرا تھی۔ دن بھر نہایت گندے میلے ہوتے نیلے کاسنی کالے کپڑے پہنے رہتی پاؤں میں کبھی جوتی نہ دیکھی۔ لوہے کی کرسی پہ بیٹھ کر ریڈیو سنتی۔ گلنار دراصل گرگٹ کی مانند تھی۔ رات کے وقت وہ بڑی اعلیٰ قسم کی جہاندیدہ طوائفوں کی بزنس فیل کر دیتی اور دن کے وقت اللہ میاں کی گائے بنی رہتی۔ اسلئے اسے سمجھنا مشکل تھا۔

بوبو جی نے ان دونوں کو بڑی محبت سے باورچی خانے میں بٹھا کر بھنے ہوئے قیمے، ڈھیلے کا اچار، اور کا جر کا مربّہ پیش کیا۔ اور جب وہ کھا چکے تو وہ گرم پانی کی بوتل میں چولہے سے کیتلی اٹھا کر پانی ڈالنے لگیں اور بولنے لگیں۔

"سن بیٹا! اب میں چلتی ہوں۔ جب غازی چلا جائے تازی بیٹا تو اندر سے کنڈی لگا لینا۔ رستہ کھلا نہ رہے۔"

ایک بار دل کھول کر دعائیں دینے کے بعد کلیجے سے گرم پانی کی بوتل لگائے وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

غطفر اس کھڑکی میں جا بیٹھا جہاں سے چاندنی میں شاہی مسجد بڑی پراسرار نظر آ رہی تھی۔

غازی اور گلنار ایک ہی پلنگ پر بیٹھے تھے۔ دونوں چپ تھے۔ نہ غازی نے گلنار سے کوئی بات کی نہ گلنار نے اسے بلایا۔ بڑی دیر جب اسی طرح گزر گئی تو گلنار نے آہستہ سے پوچھا۔

"تیل ڈال دوں آپ کے سر میں؟"

غازی نے مثبت جواب دیا نہ منفی۔ آرام سے پلنگ پر لیٹ گیا۔ گلنار نے الماری میں کڑوے تیل کی کپی نکالی۔ غازی کے سر کو اپنے زانو پر رکھا۔ اور بڑے انہماک سے اس کے سر میں چمپی کرنے لگی۔ بغیر بولے کوئی پون گھنٹہ تیل ڈلوانے کے بعد غازی کا ماتھا اور کان تک تیل سے تر ہو گئے۔ تو گلنار نے تولیے سے اس کا سر اور اپنے

ہاتھ پونچھے اور ڈریسنگ ٹیبل سے سرمہ دانی اٹھا لائی۔

غازی کے سر کو مضبوطی سے پکڑ کر نازی نے جلدی جلدی دو سلائیاں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

غازی نے گلنار کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں لیا اور بڑی عقیدت سے اسے بو دے کر بولا۔

"لو جی . . . اب ہم چلے . . . ؟"

گلنار وہیں بیٹھی رہی لیکن جب وہ سیڑھیاں اتر رہے تھے تو اوپر دالانے کے سے کی چٹخنی لگنے کی آواز ظفر نے محسوس کی تھی۔

"یہ کیا واہیات بات ہے؟"

غازی بت بنا اترتا جا رہا تھا۔

"کچھ پیسے نہیں دیتے یہاں؟"

"بابا جی، اکنی نہیں لیتیں مجھ سے۔ بیٹا بنایا ہوا ہے انہوں نے مجھے؟"

جب انہوں نے ہوسٹل کے لئے تانگہ لے لیا۔ تو ایک بار پھر ظفر نے پوچھا۔

"یار یہ کیا واہیات بات ہوئی۔ تیل گروایا، سرمہ ڈلوایا اور لوٹ کے بدھو گھر کو آیا . . . ؟"

"بس اتنی ہی بات ہے؟"

"اتنی ہی بات کے لئے اتنی دور آتے ہو . . . ؟"

غازی بہت دیر خاموش رہا۔ جب موہنی روڈ کے سامنے تانگہ پہنچا تو وہ آہستہ سے بولا۔

"میری ماں بھی یہی کچھ کرتی تھی۔ پہلے سر میں تیل ڈالتی تھی۔ پھر سرمے کی دو سلائیاں لگاتی تھی آنکھوں میں اور پھر پیار ماتھا پر کھینچتی تھی۔"

اس کے بعد ظفر کبھی غازی کے ساتھ نازی کے کوٹھے پر نہ گیا۔ اسے اس کوٹھے سے خوف آتا تھا۔ ایسا گھریلو ماحول تو ان کے تین منزلہ مکان میں بھی نہ تھا!

غازی کے جانے کے بعد ظفر نے موٹی کتاب میں سے رشیدہ کے نام لکھا ہوا خط نکالا اور اسے پوسٹ کرنے آہستہ آہستہ نیچے اتر گیا۔

رشیدہ کو دو خط اکٹھے ملے۔ ایک تو ظفر کا دوسرا وہ دعوت نامہ جو اس کی ہم جماعت طیبہ نے اپنی سالگرہ کے بلاوے کے طور پر بھیجا تھا۔

ظفر کا خط سادہ نیلے کاغذ کا چھوٹا سا پرچہ تھا۔ نہایت ہی سادہ اور مختصر:

محترمہ!

شاید آپ یہ خط پا کر خفا ہوں گی۔ ممکن ہے آپ میری رپورٹ بھی کر دیں لیکن خوفزدہ ہونے کے باوجود میں آپ کو خط لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا۔ بس آپ سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ جیسی [illegible] لگتی ہیں۔ میری تمنا ہے کہ آپ کبھی ملوث نہ ہوں۔

نیک دعاؤں کے ساتھ: ظفر احمد

اس خط میں ایک حرف بھی محبت کے متعلق نہ تھا۔ پھر بھی رشو کا دل مرغی کے پوٹے کی طرح خدشات کے پتھروں سے بھر گیا۔ اس نے جلدی سے کنڈی چڑھائی۔ اور اس خط کو چھپانے کی جگہ ڈھونڈنے لگی۔ لیکن پہلے اس نے حوصلہ کر کے اس خط کو جلا دینے کی ٹھانی۔ مگر محبت نامے کو جلا دینا اتنا سہل نہیں ہوتا۔ وہ بھی اس وقت جبکہ یہ زندگی کا پہلا تجربہ ہو۔

رشو جان نے بلی کے بچے کی طرح اس خط کو چھپانے کے کئی جتن کیے۔ کبھی تکیے تلے، کبھی نوٹ بک میں۔ کبھی پرس میں۔ لیکن کہیں بھی اس خزینہ جانسوز کو رکھنے سے تسلی نہ ہوتی۔ بالآخر اس نے اس حرزِ جان کو ٹالی کے اس خالی ڈبے میں رکھا جو خالد نے اسے بہاولپور سے چلتے وقت دیا تھا۔ اس ڈبے کو ٹرنک کی تہہ میں اخبار اور لٹھے کی شلواروں کے درمیان چھپایا اور چپ چاپ پلنگ پر جا لیٹی۔

ظفر پر یکدم اسے غصہ آنے لگا۔ . . . یہ ہوتا کون ہے مجھے خط لکھنے والا . . . میں اسے کالج سے نکلوا دوں گی۔ . . . اونہہ! . . . ہاں . . . بالکل" ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ پر بھی غصہ آنے لگا۔ اللہ میں نے اسے ٹالی کے ڈبے میں کیوں رکھ لیا ہے؟ . . . . جلا دینے کے قابل تھا۔ . بالکل . . . بالآخر دل نے سمجھایا کہ یہ تو پرنسپل کو دکھانے کی خاطر امانتاً رکھا ہے۔ ایسی درگت کراؤں گی جناب کی کہ ساری ظفر مندی شکست فاش میں بدل جائے گی۔

بڑی دیر تک وہ ظفر کے متعلق سوچتی رہی جب غصے کا پہلا ابال ختم ہو گیا تو

ظفر کی شکل ابھرنے لگی۔

ظفر جیلیٹین کی طرز کا لڑکا تھا کہ اوندھے پن، بدہیئتی اور بدوضعی کے باوجود اس پر نظر پڑتی تھی۔ کپڑوں کی طرف سے وہ ہمیشہ لاپرواہ رہا۔ بوٹ پالش کئے اسے ہفتے گذر جاتے۔ شیو کے معاملے میں کبھی کبھی تو وہ اس قدر محتاط ہو جاتا کہ دن میں دو بار کھونٹی نکالے پھرتا اور کبھی ہلکی ہلکی داڑھی رکھ کر بیوی کٹ کا سگریٹ بن جاتا۔

ظفر پر جو بھی موڈ طاری ہوتا اس میں ہمیشہ شدت کا پہلو ہوتا۔ ایک بار نویں جماعت میں اسے سنگھاڑے کھانے کا خبط ہوا تھا۔ ایک دن میں سیروں سنگھاڑے کھا لیتا۔ اور منہ سے لیکر آنتوں تک سفید سیمنٹ سے بھر جاتا۔ کالج کے پہلے دو سال مباحثوں میں اسقدر گرمجوشی سے حصہ لیا کہ ہر ڈکلیمیشن، ہر کونٹسٹ ہر مباحثہ اس کے بغیر نامکمل رہتا۔

کالج میں اسے کنگ آف سپیکرز کہتے تھے۔ بحث کو الجھانا، مباحثے میں شریک ہونے والے تمام ارکان کو پٹڑی سے اتارنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ایوان میں جو بھی بحث اس کی زیرِ صدارت ہوتی ہمیشہ کامیاب ہوتی۔ اور جس بحث میں وہ سپیکر بن کر داخل ہوتا اس سیشن میں صرف اس کو داد ملتی۔ وہ بڑا مجمع گیر، آتش نفس اور خوش گفتار تھا۔ انگریزی، اردو، پنجابی تینوں زبانوں میں اتنی روانی سے اور اتنی جلدی بولتا جیسے بجلی کے بٹن دبا رہا ہو۔

تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا تو اسے تھرڈ ڈویژن کے باوجود بڑی آسانی سے داخلہ

مل گیا۔ پرنسپل کو خیال تھا کہ یہ آدمی اپنے میرٹ کی وجہ سے کالج کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ظفر مکمل طور پر مباحثوں سے اکتا چکا ہے۔ اور تو اور وہ تو ڈیکلیمیشن کو سننے کے لئے بھی نہ جاتا۔ بہت سے لڑکوں نے اُسے مباحثوں میں شرکت کرنے پر مجبور کیا۔ ہر بار وہ یہی کہتا۔

”بحث کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ بال کی کھال اکھیڑنے سے حاصل؟ بیکار بلا سے آپ چاہے کچھ سمجھتے ہوں مجھے اپنے نظریوں کے متعلق شکوک نہیں ہونے چاہییں۔ آپ اگر اس عہد میں بھی دنیا کو چپٹا سمجھتے ہیں تو آپ کی مرضی۔ یہ ملک آزاد ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہونا چاہیے۔“

مباحثوں کی ہنگامہ خیز فضاؤں سے نکل کر ظفر نے اپنے آپ کو نغمے کی بیکراں وسعتوں کے حوالے کر دیا۔ بی اے کے فائنل میں پہنچتے تک اس کے پاس تین ٹیپ ریکارڈر، ایک ریڈیوگرام، دو ٹرانزسٹر اور ایک پرانا گراموفون اکٹھے ہو گئے۔ ہر محفل موسیقی میں سینے پر ہاتھ رکھے شرکت کرنا اس کا اولین فرض تھا۔ اس کے پاس روشن آرا، نزاکت علی، سلامت علی، امانت، فریدہ، ثریا ملتانیکر، زاہدہ سلطانہ کے وہ ٹیپ تھے جو شاید ریڈیو پاکستان کی لائبریری میں بھی موجود نہ تھے۔ وہ گھنٹوں پکا گانا سن سکتا تھا۔ اس سحر ذخار سے نکلتا تو ریڈیوگرام پر فلمی گیت سنتا۔ لتا اور نور جہاں کے گیت، خورشید انور کی دھنیں، جھنڈے خاں کے گیت، یہ موسیقی چٹنی دار پاپڑوں کی طرح ہلکی پھلکی اور دل کی فضا کو ملائم کرنے کے لئے ناگزیر تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ گراموفون نکال کر پلنگ

ے پاس رکھ لیتا۔ اور پرانی فلموں کے گیت بجاتا۔ دیو داس، چنڈی داس، زندگی
کی، ابھاگن، ودیا پتی، چتر لیکھا کے گیت، ان گیتوں کی فضا سے وہ ناواقف تھا۔ ان
فلموں سے اس کی پود دور ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسے ان کانوں سے دیوانہ کا سا
عشق تھا۔ سہگل، کانن بالا، خورشید، کے سی ڈے، وحیدن، اختری بائی کے گیت...
پہاڑی سانیال اور سریندر کے نغمے، رام دلاری کا لوچ، اسے ان گیتوں سے عشق تھا،
وہ ان گیتوں کی فضا میں سانس لیتا تھا۔ وہ کنول کے پھول کی طرح ان گیتوں کی سروں پر
ڈولتا پھرتا۔

ایک طرح سے یہ عہد ظفر کا عالم عرفان تھا۔ اس وقفے میں وہ اپنے آپ سے آگاہ
ہوا، اسنے ہر طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ اور اپنے آپ کو موسیقی کے قلعے میں محبوس کرلیا۔
اس قلعے میں سے اسے نکالنے والی فلم کی سوہنی تھی۔ موسیقی سے رشتہ ٹوٹا تو فلم
بینی سے ناطہ پیدا ہوگیا۔ یہ عہد ظفر کے لیے بڑا شورش انگیز تھا۔

مگر اس دور کا قیام مختصر تھا لیکن اس عہد میں ظفر نے صرف دو کام کیے۔ ایک تو اپنے
لباس پر توجہ دی اور دوسرے دن میں تین تین شو دیکھے۔ فلمی رسالوں کی چالیس سیر ردی اس
کے کمرے میں جمع ہوگئی۔ جب یہ شوق ختم ہو جانے پر اس نے چھ آنے سیر کے حساب سے ردی
والے کو بیچ دیا۔ اس ردی میں انڈیا کا مشہور فلم فیئر، فلم کوارٹرلی، ہندوستان کا ہفتہ وار فلمی
اخبار جس کی ایڈیٹر غالباً ایک عورت تھی۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے رسالے جن کی چھپائی
لکھائی نادیدہ زیب، نیوز پرنٹ کا کاغذ، اور ٹرائی کلر کی تصویریں بہت ناقص ہوا کرتی تھیں،

ان دنوں اس کے پاس گیری کوپر، گریگری پک سے لے کر صبیحہ، مسرت نذیر اور زرینہ ریشیاں تک کے نام بھی اور مختلف حالات کی فرضی ڈائری موجود تھی۔ وہ ہندوستان کی فلموں اور فلم انڈسٹری آف پاکستان پر سیر حاصل بحث کر سکتا تھا۔ سنسر اور پروڈکشن کی مشکلات خام فلم کی دستیابی، ان ڈور شوٹنگ کی خرابیاں، آؤٹ ڈور شوٹنگ میں ساؤنڈ اور لائٹ کی تحفظات۔ کہانی میں جو الجھاؤ پیدا ہوتے ہیں انہیں سلجھانے، سسپنس پیدا کرنے اور "نکتہ عروج" بنانے کے کئی عمدہ طریقے، اسے معلوم تھے۔ اس میں انگمار برگمین، الفرڈ ہچکاک، ستیا جیت رے اور سسل بی ڈیمل کی روح کا ملغوبہ تڑپ رہا تھا۔ ان دنوں وہ ایک فلمساز تھا، کیمرہ مین تھا، صوتی اثرات کا ماہر تھا۔

یہ عہد بڑا جنون خیز اور دہشت انگیز تھا۔ شاید وہ فلمی دنیا میں ڈوب کر کبھی نہ ابھرتا اور بالآخر کسی سٹوڈیو میں لائٹ آن آف کرنے پر مامور ہو جاتا لیکن یہ دور بھی ختم ہو گیا۔۔۔ اور اس کے خاتمے کی ساری ذمہ داری نمازی پر تھی۔۔۔

فلمی جنون ختم ہونے کے بعد ظفر پر قلمی دوستی کا بخار چڑھا۔ اخباروں، رسالوں میں سے ایڈریس لے کر یہ سلسلہ چلایا گیا۔ ظفر کے جنون میں ایک خوبی ضرور تھی۔ وہ اپنے سودائی پن کو شاہجہان کی طرح تاج محل صورت ضرور بنا دیا کرتا تھا۔ قلمی دوستی کا حلقہ جب بہت بڑھا تو اس نے ایک سوسائٹی کی شکل اختیار کر لی۔ تیسری منزل پر ایک بورڈ نصب کیا گیا جس پر انگریزی میں فلوروسنٹ رنگوں میں لکھا گیا۔۔۔

"انٹرنیشنل فرینڈشپ ہاؤس۔ سیکریٹری۔۔۔ ظفر احمد ملک۔"

رفتہ رفتہ بیرونی ممالک سے ڈاک آنے لگی۔ نائجیریا، روڈیشیا، تنزانیہ، ہیٹی لیبیا، مسقط، صومالیہ جیسی نامانوس جگہوں سے بدیسی زبانوں میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں خط اور تصویریں ظفر تک پہنچنے لگیں۔ وہ نزانہ، ہنکیانگ، کاسٹاریکا، فیما، سان مارینو، تنزانیہ اور روڈہاؤن جیسے نام اپنی گفتگو میں آسانی سے استعمال کرنے لگا۔ ان دنوں اس کے پاس عجیب و غریب خوش رنگ ٹکٹ اکٹھے ہو گئے۔

مختلف ممالک ان کے عقائد، رسومات، نسلی امتیازات، مذہبی تنازعوں میں ظفر کو بڑی گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ رفتہ رفتہ ان علاقوں سے محبت کرنے لگا تھا جس میں اس کے دور افتادہ دوست بستے تھے۔ یہ شوق اس کے ان خوابوں کا باعث بنا جو وہ اس کے متعلق دیکھنے لگا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر دنیا کے تمام نوجوان عالمی امن کے لئے ایسی سوسائٹیاں بنا کر اپنے اپنے گھر کی تیسری منزل پر اسی نام کے بورڈ ٹانک لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بقائے امن کی مشکل آسان نہ ہو جائے۔

اسی سلسلے میں وہ شہر کے گلی کوچوں میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو روک کر ان سے اپنے ریزولیوشن پر دستخط کرنے کو کہتا۔ اس کے پاس اس طرح کے لاکھوں دستخط جمع ہو گئے تھے۔ ایسا ہی دستخط حاصل کرنے کے لئے اس نے ایک دن رشیدہ کو بھی گیٹ کے پاس روک لیا۔

”بس، ایک لمحہ رکئے ذرا . . .“

رشیدہ نے اس وقت یوں محسوس کیا جیسے زمین اس کے پیروں تلے سے کھسک

گئی ہو۔ ۔ ۔

"جی"

"ہم نے ایک موومنٹ بنائی ہے۔ ۔ ۔ عالمی امن کی تحریک۔ ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی مجھے کسی تحریک سے کوئی تعلق نہیں۔ ۔ ۔"

"اس تحریک کے لئے آپ کو کچھ نہیں کرنا ہوگا مس! مجھے صرف آپ کے دستخط چاہییں اس جگہ۔ ۔ ۔"

ظفر نے وہی فل سکیپ کاغذوں کا پلندہ رشو کو پیش کر دیا۔ اغراض و مقاصد پر غور کئے بغیر رشیدہ نے جلدی سے اپنے نام کو آخری دستخطوں کے نیچے لکھ دیا اور لشر کی چادر سنبھالتی آگے چلی گئی۔

نہ جانے اس لڑکی میں کیا بات تھی۔ نہ جانے اس میں کونسی ادا ایسی تھی جس نے یکدم عالمی امن کا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ بد دلی سے ظفر نے پلندے کو موٹر سائیکل کی ڈگی میں بند کیا اور دیر تک اس لڑکی کے متعلق سوچتا رہا جسے جاننے کے بعد عالمی امن کی بقا بے معنی سی ہو گئی۔ چونکہ ظفر پر مہینوں کی کیفیت پلوں میں گذر جاتی تھی۔ اس لئے جب اسے رشیدہ سے محبت ہوئی تو وہ فیس صورت گرا۔ محبت کی واردات اس پر وجدانی تھی۔ وہ چاہتا تو اسی وقت کپڑے پھاڑ کر بنوں کو نکل جاتا۔ اپنا نام وحید رکھوا تا اور کانوں کو چروا کر ان میں مندرے ڈلوا لیتا۔ وہ اگر پسند کرتا تو بی آر بی نہر کا

رخ موڑ کر خالہ فیروزہ کی کوٹھی کے آگے سے گذار دیتا۔

اس کے دیوانے پن کی کوئی حد نہ تھی۔ لیکن ان باتوں کا اسے خیال نہ آیا۔ اُسے تو بس یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے وجود پر پیٹرول کی بوتل چھڑک بھک سے جلا دیا ہو۔ ۔ ۔ ظفر کہاں ہے؟ ۔ ۔ کون ہے؟ ۔ ۔ کیا کرتا ہے؟ ۔ ۔ کیوں ہے؟ ۔ ۔ ان باتوں کا واہمہ بھی اس کے دماغ سے نکل گیا تھا۔ انا کے تمام سرخابی پر اتار پھینکنے کے بعد اندر سے وہ فاختئی رنگ کی کبوتری نکل آئی تھی جس کا سارا وجود ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

یہ رنگ تھا رشیدہ کی محبت کا رنگ۔ پیروں میں روندا ہوا رنگ۔ وہ کالج کے ہر واقف لڑکے سے رشو کی باتیں کرتا۔ فرصت کے لمحوں میں اسے خط لکھتا۔ بازاروں میں سے اس کے لیے تحفے خریدتا۔ اور پھر انہیں اپنے ٹرنک میں بند کر دیتا۔

رشو اس پر گھٹا ٹوپ بادل بن کر چھا گئی۔ ۔ ۔ لیکن یہ باتیں بہت بعد کی ہیں۔

جس وقت عالی اس کے ریزولیوشن پر دستخط کرنے کے بعد رشیدہ لیڈیز روم میں پہنچی تو وہاں سے پولیٹیکل سائنس والی لڑکیوں کا گروہ باہر نکل رہا تھا۔ ان لڑکیوں کے ناموں سے تو رشو واقف نہ تھی ہاں علیک سلیک ضرور تھی۔ اونچی ایڑیوں کو ٹکٹکاتی ان خوبصورت بلاؤں کا غول بیابانی چلا گیا تو وہ لیڈیز روم میں پہنچی۔ طیبہ۔ ڈمپل اور طاہرہ آپس میں بہنیں ہی تھیں حسب عادت لمبی مہاگنی کی میز پر چڑھی بیٹھی تھیں جلیبوں کے چھلکے، چائے کے پیالے اور ان کے وجود سیاہ میز کی سطح پر منعکس ہو رہے تھے۔